ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2640

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ فکر اسلامی، تاریخ وثقافت)

کورس: اصول وآدابِ افتا (2640) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ نمبر 1–4)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: افتا، استفتا اور قضا — حقیقت، باہمی تعلق اور امتیازات

سوال نمبر 1۔ افتا، استفتا اور قضا کی حقیقت واضح کرتے ہوئے ان کے باہمی تعلق اور امتیازات بیان کیجیے۔ (20)

تمہید

اسلامی فقہی نظام میں تین اصطلاحات ایسی ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے قریب معلوم ہوتی ہیں مگر ان میں سے ہر ایک کا اپنا مستقل دائرہ، اپنا طریقہ کار اور اپنے قانونی اثرات ہیں: افتا، استفتا اور قضا۔ عام طالب علم اکثر ان تینوں کو ایک ہی معنی میں لے لیتا ہے، حالانکہ فقہا نے ان کے درمیان باریک اور اہم فرق قائم کیے ہیں۔ افتا کا تعلق شرعی حکم کی وضاحت اور رہنمائی سے ہے، استفتا اس رہنمائی کو حاصل کرنے کے عمل کا نام ہے، اور قضا کا تعلق تنازعات کے فیصلے اور ان کے نفاذ سے ہے۔ اس سوال میں پہلے ان تینوں اصطلاحات کی لغوی و اصطلاحی حقیقت واضح کی جائے گی، پھر ان کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی جائے گی اور آخر میں ان کے امتیازات کو منظم انداز میں پیش کیا جائے گا تاکہ طالب علم پر یہ فرق پوری طرح واضح ہو جائے۔

افتا کی حقیقت

افتا عربی لفظ ہے جس کا مادہ 'ف ت ی' ہے، اور اس کے لغوی معنی جواب دینے، مشکل مسئلہ واضح کرنے اور رائے دینے کے ہیں۔ قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ ﴿وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ ۖ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ﴾ (النساء: 127) میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے شرعی رہنمائی کو 'یُفْتِیکُم' کہا گیا ہے۔ اصطلاحی طور پر افتا سے مراد کسی پیش آمدہ مسئلے میں قرآن و سنت، اجماع اور قیاس کی روشنی میں شرعی حکم بیان کرنا ہے، خواہ وہ مسئلہ عبادات سے متعلق ہو یا معاملات، اخلاق سے ہو یا سماجی زندگی سے۔ جو شخص یہ کام سرانجام دیتا ہے اسے مفتی اور جو سوال کرتا ہے اسے مستفتی کہتے ہیں۔ افتا کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک علمی اور اجتہادی عمل ہے جس کی حیثیت خبر اور رہنمائی کی ہے، یعنی مفتی شرعی حکم کی اطلاع دیتا ہے، وہ اس حکم کو نافذ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔

فقہا کے نزدیک فتویٰ دینا ایک عظیم ذمہ داری ہے کیونکہ مفتی دراصل شریعت کی طرف سے حکم کی ترجمانی کرتا ہے۔ اسی لیے اردو و عربی کی فقہی کتب میں کہا گیا ہے کہ مفتی گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے دستخط کرنے والا (الموقّع عن اللہ) ہوتا ہے۔ فتویٰ کی یہ حیثیت اسے محض رائے سے ممتاز کرتی ہے؛ فتویٰ میں مفتی اپنی ذاتی پسند نہیں بلکہ دلائل کی روشنی میں شرعی حکم پیش کرتا ہے، اور اگر اسے کسی مسئلے کا علم نہ ہو تو اسے صراحتاً 'لا ادری' (مجھے معلوم نہیں) کہنا چاہیے۔

استفتا کی حقیقت

استفتا کا لغوی معنی فتویٰ طلب کرنا، رہنمائی مانگنا اور کسی جاننے والے سے مسئلہ پوچھنا ہے۔ اصطلاحی طور پر استفتا اس عمل کو کہتے ہیں جس میں ایک عام شخص یا وہ شخص جسے کسی مسئلے میں شرعی حکم معلوم نہ ہو، کسی اہلِ علم مفتی سے سوال کر کے حکم معلوم کرے۔ قرآن مجید نے اس کی بنیاد اس آیت میں رکھی: ﴿فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (النحل: 43)، یعنی اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھ لو۔ یہ آیت استفتا کے جواز اور اس کی ضرورت کی اصولی دلیل ہے۔ استفتا میں سائل پر لازم ہے کہ وہ اپنا مسئلہ پوری صحت اور ایمانداری کے ساتھ پیش کرے، واقعے کی تفصیلات نہ چھپائے اور نہ ہی اندازے سے سوال کرے کہ مطلوبہ جواب نکل آئے، کیونکہ غلط یا ادھوری معلومات پر مبنی فتویٰ غلط نتیجے تک پہنچا سکتا ہے۔

استفتا اور افتا دو طرفہ عمل کے دو پہلو ہیں: ایک ہی علمی مجلس میں پوچھنے والا مستفتی ہوتا ہے اور جواب دینے والا مفتی، اور سوال و جواب کا یہ مجموعہ استفتا و افتا کہلاتا ہے۔ استفتا کرنا ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو خود اجتہاد کی صلاحیت نہ رکھتا ہو؛ عوام کے لیے اہلِ علم سے پوچھنا ہی شریعت پر عمل کا محفوظ راستہ ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ مستفتی کے لیے کسی مخصوص مفتی ہی سے پوچھنا لازم نہیں، وہ اہل و معتبر علم رکھنے والے کسی بھی مفتی سے رجوع کر سکتا ہے۔

قضا کی حقیقت

قضا کے لغوی معنی فیصلہ کرنا، حکم لگانا اور کسی امر کو قطعاً طے کر دینا ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ فیصلے اور تقدیر دونوں معنوں میں آیا ہے۔ اصطلاحی طور پر قضا سے مراد ریاست کی طرف سے مقرر کردہ جج (قاضی) کا وہ اختیاری فیصلہ ہے جو فریقین کے درمیان تنازعے کو شرعی و قانونی دلائل کی روشنی میں ختم کر دے اور جس پر عمل درآمد حکومتی قوت سے کرایا جا سکے۔ قضا کا ادارہ اسلامی ریاست کے بنیادی اداروں میں سے ہے؛ رسول اللہ ﷺ نے خود فیصلے فرمائے اور مختلف علاقوں میں قاضی مقرر کر کے بھیجے، جن میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجنا مشہور مثال ہے۔ قاضی کا فیصلہ ظاہری دلائل و شہادتوں کی بنیاد پر ہوتا ہے اور وہ فریقین پر بائنڈنگ (لازم) ہوتا ہے، چاہے اندرونی حقیقت اس سے مختلف ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ عدالت ظاہر پر فیصلہ کرتی ہے۔

تینوں کا باہمی تعلق

افتا، استفتا اور قضا تینوں کا مقصدِ اصلی ایک ہی ہے: اللہ تعالیٰ کے حکم کو جاننا اور اس پر عمل کرانا۔ تینوں کا ماخذ قرآن و سنت اور فقہی اصول ہیں، تینوں میں علم و دیانت شرط ہے، اور تینوں کا تعلق عدل و انصاف کے قیام سے ہے۔ استفتا اور افتا کا تعلق تو سوال و جواب جیسا لازم و ملزوم ہے کہ ایک کے بغیر دوسرا مکمل نہیں ہوتا۔ افتا اور قضا کا تعلق یہ ہے کہ دونوں میں شرعی حکم بیان کیا جاتا ہے؛ بس اوّل میں بیان بطور رہنمائی ہوتا ہے اور دوم میں بطور فیصلہ۔ عملی زندگی میں یہ تعلق اس طرح بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عدالتیں پیچیدہ فقہی مسائل میں اہلِ علم سے رائے (فتویٰ/ماہر کی رائے) لے سکتی ہیں، اور قاضی خود بھی صاحبِ علم ہوتا ہے۔ اسی طرح بہت سے معاملات عدالت تک جاتے ہی نہیں کیونکہ لوگ استفتا کر کے فتویٰ پر عمل کر لیتے ہیں، یوں افتا قضا کے بوجھ کو کم کرنے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

امتیازات: تقابلی جائزہ

جدول۔ افتا، استفتا اور قضا کے درمیان نمایاں فرق

پہلو	افتا	استفتا	قضا
حقیقت	شرعی حکم کی وضاحت و رہنمائی	شرعی حکم پوچھنے کا عمل	تنازعے کا باضابطہ فیصلہ
کرنے والا	مفتی (اہلِ علم)	مستفتی (سائل)	قاضی (ریاست کا مقرر کردہ جج)
نفاذ کی طاقت	الزامی نہیں، اخلاقی و دینی حیثیت	محض سوال کرنے کا عمل	الزامی، حکومتی قوت سے نافذ ہوتا ہے
دائرہ	تمام شرعی مسائل (عبادات و معاملات)	سائل کی ضرورت کے تمام مسائل	صرف متنازعہ معاملات و حقوق
شرائط	علم، اجتہادی صلاحیت، تقویٰ	مسئلے کی درست پیش کشی	اہلیت، تقرری، دلائل و شہادت کی

سماعت			

جدول کے علاوہ چند اور فرق قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل، فتویٰ قابلِ تبدیلی ہے: اگر دلائل بدل جائیں یا مسئلے کی صورت بدل جائے تو مفتی اپنے فتویٰ سے رجوع کر سکتا ہے، جبکہ قاضی کا فیصلہ (جو استثنائی صورتوں کے سوا) حتمی ہوتا ہے اور اسی پر عمل ہوتا ہے۔ دوم، فتویٰ عام بھی ہو سکتا ہے (کسی بھی شخص کے مسئلے پر) اور خاص بھی، جبکہ قضا کا فیصلہ صرف انہی فریقین کے لیے ہوتا ہے جن کا مقدمہ پیش ہوا۔ سوم، مفتی کے لیے کسی تقرر شرط نہیں، ہر اہلِ علم فتویٰ دے سکتا ہے، مگر قاضی بننے کے لیے ریاست کی طرف سے تقرر ضروری ہے۔ چہارم، فتویٰ میں مفتی واقعے کی وہی صورت لیتا ہے جو سائل بیان کرتا ہے، جبکہ قاضی واقعے کی تحقیق خود کرتا ہے، گواہ سنتا ہے اور قسم بھی لے سکتا ہے۔ پنجم، فتویٰ کا اثر آخرت و ضمیر کے اعتبار سے بھی ہوتا ہے جبکہ عدالتی فیصلے کا تعلق بنیادی طور پر دنیا کے ظاہری نظام سے ہے، جیسا کہ مشہور حدیث کا مفہوم ہے کہ قاضی کا فیصلہ حرام کو حلال نہیں کر دیتا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ کہ افتا شرعی رہنمائی دینے کا علمی عمل ہے، استفتا اس رہنمائی کو طلب کرنے کا نام ہے اور قضا ریاست کے ذریعے تنازعات کے الزامی فیصلے کا ادارہ ہے۔ تینوں مل کر اسلامی معاشرے میں شریعت کی بالادستی، عدل کے قیام اور لوگوں کی دینی رہنمائی کا نظام تشکیل دیتے ہیں۔ ان کے امتیازات کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ فتویٰ کو عدالتی فیصلہ سمجھ لینا یا عدالتی فیصلے کو فتویٰ سمجھنا دونوں علمی و عملی غلطیوں کا باعث بنتے ہیں۔ طالبِ علم کے لیے یہ تفریق اصولِ افتا کی بنیادی اینٹ ہے جس پر آگے کے تمام ابواب قائم ہیں۔

سوال نمبر 2: مفتی اور مستفتی کے علمی واخلاقی آداب

سوال نمبر 2۔ مفتی اور مستفتی کے علمی واخلاقی آداب کیا ہیں؟ قرآن وسنت اور فقہی روایت کی روشنی میں ان آداب کی اہمیت اور ان سے انحراف کے نتائج پر بحث کیجیے۔

(20)

تمہید

فتویٰ دینا اور لینا بظاہر ایک سوال وجواب کا عمل ہے، مگر اسلامی روایت میں اسے نہایت نازک اور ذمہ دارانہ دینی خدمت قرار دیا گیا ہے۔ مفتی شریعت کی طرف سے حکم بیان کرتا ہے اور مستفتی اپنے دین و دنیا کے فیصلے اس جواب پر موقوف رکھتا ہے۔ اس سنگینی کی وجہ سے فقہا نے 'آداب المفتی والمستفتی' کے نام سے باقاعدہ ادب کی کتب لکھیں، جن میں امام نوویؒ کی 'آداب الفتویٰ والمفتی والمستفتی' اور ابن الصلاحؒ کی تصانیف نمایاں ہیں۔ ان آداب کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: علمی آداب، جن کا تعلق اہلیت، تحقیق اور احتیاط سے ہے، اور اخلاقی آداب، جن کا تعلق نیت، خشیت، تواضع اور امانت سے ہے۔ یہ آداب محض رسمی تقاضے نہیں بلکہ یہی وہ حفاظتی دیوار ہیں جو فتویٰ کو رائے زنی، خواہش پرستی اور گمراہی سے بچاتی ہے۔

مفتی کے علمی آداب

مفتی کے علمی آداب میں سب سے پہلا ادب یہ ہے کہ وہ صرف اسی مسئلے میں فتویٰ دے جس کا اسے کامل علم ہو۔ قرآن مجید نے بغیر علم کے بات کہنے سے سختی سے منع کیا ہے: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾ (الاسراء: 36)۔ دوسرا ادب تحقیق و تطبیق ہے: مفتی مسئلے کی صورتِ واقعہ کو اچھی طرح سمجھے، کیونکہ حکم کا مدار واقعے کی درست تصویر پر ہوتا ہے؛ فقہا کا مشہور اصول ہے کہ 'مسئلے کا اچھی طرح سمجھنا آدھا جواب ہے'۔ تیسرا ادب مراجع و مآخذ کی طرف رجوع ہے؛ مفتی کو قرآن، سنت، اجماع، اپنے مسلک کی معتمد کتب اور اسی مسئلے میں سابقہ فقہا کی آراء دیکھے بغیر جلدی میں جواب نہیں دینا چاہیے۔ چوتھا ادب عدمِ علم کا اعتراف ہے: صحابہ و سلف سے منقول ہے کہ وہ بے شمار مسائل میں 'لا

ادری' کہہ دیتے تھے اور اسے علم کی نصف علامت سمجھتے تھے۔ پانچواں ادب یہ ہے کہ مفتی فتویٰ لکھتے وقت وضاحت، ترتیب اور حوالے کا اہتمام کرے تاکہ سائل اور پڑھنے والا دلیل سے آگاہ ہو سکے۔

مفتی کے اخلاقی آداب

اخلاقی آداب میں سرِ فہرست اخلاص و خشیتِ الٰہی ہے۔ فتویٰ دنیا طلبی، شہرت یا کسی فریق کی خوشامد کے لیے نہیں دیا جاتا بلکہ اللہ کی رضا کے لیے دیا جاتا ہے؛ قرآن نے اہلِ کتاب کے ان علماء کی مذمت کی ہے جو حق کو چھپاتے یا دنیاوی فائدے کے عوض بدل دیتے تھے۔ دوسرا اخلاقی ادب تواضع ہے: مفتی اپنے علم کو فضلِ الٰہی سمجھے، تکبر سے بچے اور دوسرے علماء کی آراء کا احترام کرے۔ تیسرا ادب پرہیز و تقویٰ ہے، کیونکہ جو شخص خود عمل میں کوتاہ ہو اس کے فتویٰ کی تاثیر کم ہو جاتی ہے۔ چوتھا ادب مستفتی کے ساتھ نرمی اور حسنِ اخلاق ہے: سائل کی جہالت پر طعن نہیں کرنا، اس کے راز کی حفاظت کرنا، اور اس کی سماجی حیثیت دیکھے بغیر یکساں رہنمائی کرنا۔ پانچواں ادب یہ ہے کہ مفتی دنیاوی دباؤ، حکمرانوں کی خوشنودی یا عوامی مقبولیت کی خاطر حق بات میں تبدیلی نہ کرے۔ چھٹا ادب امانت ہے: فتویٰ مانگنے والا اپنا مسئلہ امانت کے طور پر پیش کرتا ہے، اس کی تشہیر یا اس سے ذاتی فائدہ اٹھانا خیانت ہے۔

مستفتی کے آداب

آداب صرف مفتی پر نہیں، مستفتی پر بھی عائد ہوتے ہیں۔ مستفتی کا پہلا ادب یہ ہے کہ وہ اہل و معتبر مفتی سے رجوع کرے؛ قرآن کا حکم ﴿فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ﴾ اہل کی قید کے ساتھ ہے، اس لیے ہر کہنے والے سے دین نہیں لیا جاتا۔ دوسرا ادب مسئلے کی درست پیش کشی ہے: سائل واقعہ مکمل اور سچائی کے ساتھ بیان کرے، اپنی مرضی کا جواب نکلوانے کے لیے حقائق نہ بدلے، کیونکہ فتویٰ سائل کے بیان کے مطابق ہوتا ہے، غلط بیان کی ذمہ داری سائل پر ہے۔ تیسرا ادب ادب و احترام ہے: مفتی کی مجلس میں سوالات شائستگی سے کرے، بحث و تکرار اور ترش روئی سے بچے۔ چوتھا ادب قولِ حق کی قبولیت ہے: مستفتی اگر اپنی خواہش کے خلاف جواب ملے تو مفتی بدلنے کی بجائے حکم قبول

کرنے کی نیت رکھے؛ البتہ علمی اطمینان کے لیے دوسرے اہلِ علم سے رجوع ممنوع نہیں، مگر صرف مطلوبہ نرم جواب کی تلاش (تتبعِ رخص) فقہا کے نزدیک مذموم ہے۔

پانچواں ادب یہ ہے کہ مستفتی فتویٰ کو اس کے اصل موقع سے ہٹ کر غلط استعمال نہ کرے اور نہ اسے کسی کے خلاف ہتھیار بنائے۔

آداب کی اہمیت: قرآن، سنت اور فقہی روایت کی روشنی میں

ان آداب کی اہمیت اس سے واضح ہوتی ہے کہ قرآن و سنت نے فتویٰ کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کر کے اس کی عظمت بیان کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بغیر علم کے فتویٰ دینے پر سخت وعید فرمائی، جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص بغیر علم کے فتویٰ دے اس کا گناہ اس فتویٰ دینے والے پر ہے۔ صحابہ کرام فتویٰ دینے سے اس قدر احتیاط کرتے تھے کہ ہر ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ کوئی اور جواب دے دے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور دیگر خلفاء نے نااہل افراد کو فتویٰ دینے سے روکا اور حد مقرر کرنے کی روایت بھی منقول ہے۔ اسی فقہی روایت نے آگے چل کر مفتی کی اہلیت کی شرائط (اجتہاد یا نقلِ معتبر، عقل و بلوغ، اسلام و عدالت) کی صورت اختیار کی۔ یوں یہ آداب محض اخلاقی نصیحت نہیں رہے بلکہ نظامِ افتا کی قانونی و علمی بنیاد بن گئے، اور آداب پر مستقل کتب لکھی گئیں جن میں فتویٰ نویسی کے قواعد تک مرتب ہوئے۔

آداب سے انحراف کے نتائج

جب ان آداب سے انحراف ہوتا ہے تو اس کے نتائج فرد اور معاشرے دونوں کے لیے سنگین ہوتے ہیں۔ علمی آداب کی خلاف ورزی سے غلط فتوے جنم لیتے ہیں جن سے عبادات فاسد، معاملات میں حرام حلال میں خلط، اور خاندانی اور سماجی تنازعات پیدا ہوتے ہیں۔ اخلاقی آداب کے انحراف سے فتویٰ بکاؤ بن جاتا ہے، مفتی اور عوام کے درمیان اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور دین سے بیزاری پھیلتی ہے۔ مستفتی کے آداب کی خلاف ورزی سے 'فتویٰ شاپنگ' کا رجحان پیدا ہوتا ہے جس میں ہر شخص اپنی خواہش کے مطابق جواب ڈھونڈتا پھرتا ہے اور شریعت کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ تاریخی طور پر بھی دیکھا گیا ہے کہ جن ادوار میں غیر اہل افراد نے فتویٰ دینا شروع کیا، وہاں فرقہ واریت، بدعات اور انتشار بڑھا۔ عصرِ حاضر میں سوشل میڈیا پر بغیر تحقیق کے فوری فتوے اسی انحراف کی جدید صورت ہیں جن سے غلط فہمیاں اور شدت پسندی جنم لیتی ہے۔ اس کے برعکس جہاں آداب کی پابندی رہی، وہاں نظامِ افتا نے امت کو اختلاف کے باوجود اعتدال، وحدت اور شرعی نظم عطا کیا۔

نتیجہ

حاصلِ بحث یہ ہے کہ مفتی اور مستفتی دونوں کے لیے علمی و اخلاقی آدابِ فتویٰ کے عمل کی روح ہیں۔ مفتی کے لیے علم، تحقیق، اعترافِ عدمِ علم، اخلاص، تقویٰ اور امانت لازم ہیں اور مستفتی کے لیے اہل سے رجوع، سچی پیش کشی، احترام اور حکم کی قبولیت ضروری ہے۔ قرآن و سنت اور چودہ صدیوں کی فقہی روایت ان آداب پر متفق ہے، اور ان سے انحراف کے نتائج ہر دور میں فتنہ، انتشار اور دین کی بدنامی کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں۔ آج کے دور میں جب فتویٰ لمحوں میں دنیا بھر میں پھیل جاتا ہے، ان آداب کی پاسداری پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہو گئی ہے۔

سوال نمبر 3: فتاویٰ قاضی خان — ترتیب، مصادر، طرزِ استدلال اور مقام

سوال نمبر 3۔ فتاویٰ قاضی خان کی ترتیب، مصادر اور طرزِ استدلال کا تجزیہ کیجیے اور اس مجموعے کا مقام واضح کیجیے۔ (20)

تمہید و تعارف

فقہِ حنفی کے ذخیرے میں بعض کتب کو وہ مرکزی حیثیت حاصل ہے جن کے بغیر مفتی کے لیے فتویٰ دینا دشوار سمجھا جاتا ہے۔ انہی کتب میں 'فتاویٰ قاضی خان' سرِفہرست ہے، جس کا اصل نام 'الفتاویٰ الخانیہ' ہے اور یہ 'فتاویٰ خانیہ' کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس کے مصنف امام فخر الدین حسن بن منصور اوزجندی فرغانی المعروف قاضی خان (متوفی 592ھ) ہیں، جو چھٹی صدی ہجری کے عظیم حنفی فقیہ اور 'الہدایہ' کے مصنف امام مرغینانی کے ہم عصر و شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ فتاویٰ ماوراء النہر کے علمی ماحول میں مرتب ہوا اور اس میں اس زمانے کے پیش آمدہ مسائل (واقعات و نوازل) کو فقہی اصولوں پر پرکھ کر جوابات دیے گئے۔ سوال میں اس کتاب کی ترتیب، مصادر، استدلال کے طرز کا تجزیہ اور فقہِ حنفی میں اس کے مقام کا جائزہ مطلوب ہے۔

ترتیب و تنظیم

فتاویٰ قاضی خان کی ترتیب فقہ کی کلاسیکی ترتیب کے مطابق ہے: کتاب الطہارۃ سے آغاز ہو کر نماز، زکاۃ، صوم، حج اور پھر نکاح، طلاق، بیوع، اجارات، شفعہ، قضا، شہادات، حدود و تعزیرات وغیرہ کے ابواب آتے ہیں اور آخر میں کتاب الحظر والاباحۃ جیسے ابواب شامل ہیں۔ ہر باب کے اندر مسائل کو مسئلہ بہ مسئلہ پیش کیا گیا ہے؛ اکثر مقامات پر پہلے مسئلہ ذکر ہوتا ہے پھر جواب، اور جہاں کئی اقوال ہوں وہاں ان کی نسبت ان کے قائلین کی طرف کی جاتی ہے۔ کتاب کی نمایاں بات یہ ہے کہ مصنف نے توفیق و تطبیق کی کوشش کی ہے کہ متقدمین کے اقوال جمع کر کے ان میں سے راجح یا معمول بہ قول کی نشاندہی کر جائے۔ کئی ابواب میں مسائل کی ترتیب عام فقہی کتب سے اس لحاظ سے مختلف بھی محسوس ہوتی ہے کہ واقعاتی مسائل کو بھی عنوانات کے تحت شامل کیا گیا ہے۔ متاخرین نے اس کتاب کو اختصار و ترتیب کی سہولت کے لیے حواشی و شروح میں بھی استعمال کیا، اور یہ کئی جلدوں میں مطبوع ہے۔ اسلوب مختصر و جامع ہے، عبارت عام طور پر سادہ اور فیصلہ کن ہے، اسی لیے اسے عملی فتویٰ نویسی کے لیے مفید ترین مراجع میں شمار کیا جاتا ہے۔

مصادر

فتاویٰ قاضی خان کے مصادر کو تین طبقات میں رکھا جا سکتا ہے۔ پہلا طبقہ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن شیبانی کے اقوال و روایات کا ہے، جن کی بنیادی کتب خصوصاً 'ظاہر الروایہ' اس کا اصل سرچشمہ ہیں۔ دوسرا طبقہ متقدم حنفی مشائخ کے فتاویٰ و نوازل کا ہے، مثلاً فتاویٰ کے وہ ذخائر جو بلخ، بخارا اور سمرقند کے علماء سے منسوب تھے، نیز امام خصاف، امام طحاوی اور امام کرخی جیسے اکابر کی آراء۔ تیسرا طبقہ مصنف کے اپنے زمانے کے مشائخ اور معاصر فقہا کی آراء و اجتہادات کا ہے جہاں نئے پیش آنے والے مسائل کا جواب اصول سے استنباط کر کے دیا گیا ہے۔ قاضی خان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اکثر مقام پر قول کو اس کے قائل کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور کبھی 'قال بعضھم' یا 'فی دیارنا' جیسے اشارات سے مقامی رواج و عرف کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں۔ اس مصدری وسعت سے یہ کتاب محض نقل کا مجموعہ نہیں رہتی بلکہ مختلف روایات کو پرکھنے کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔

طرزِ استدلال

قاضی خان کا طرزِ استدلال فقہی و ترجیحی ہے۔ ان کی عمومی روش یہ ہے کہ مسئلہ پیش کر کے پہلے مشہور قول ذکر کرتے ہیں، پھر اگر اختلاف ہو تو اقوال کے دلائل کی طرف مختصر اشارہ کرتے ہیں، اور آخر میں 'وبہ یُفتی' یا 'وعلیہ الفتویٰ' جیسی عبارات سے اس قول کی نشاندہی کرتے ہیں جس پر فتویٰ دیا جانا چاہیے۔ استدلال میں قیاس، استحسان، عرف اور ضرورۃ جیسے اصولوں کا استعمال جگہ جگہ نظر آتا ہے، خاص طور پر ان مسائل میں جہاں نصوص کی صراحت نہیں ہوتی وہاں علت کی بنیاد پر حکم لگایا جاتا ہے۔ ان کا ایک نمایاں وصف یہ بھی ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنے زمانے کی صورتِ حال کے تغیر کی وجہ سے قدیم قول کے بجائے ر قول اختیار کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو وقت کے عرف کے مطابق ہو۔ احادیث و آثار سے استدلال عموماً اشارۃً ہوتا ہے کیونکہ یہ کتاب بنیادی طور پر مذاہبِ مأثورہ کے اندر رہ کر مسائل حل کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، نہ کہ کتاب و سنت سے براہِ راست استنباط کی مشق کے لیے۔ یہی طرز اسے دوسرے درجے کی 'فقہی ترجیح و اطلاق' کی کتاب بناتا ہے۔

فقہِ حنفی میں مقام

فتاویٰ قاضی خان کا مقام فقہِ حنفی میں غیر معمولی ہے۔ ابن عابدین شامی نے 'ردالمحتار' میں مفتی کے لیے جن کتب کو بنیادی مآخذ قرار دیا ہے ان میں اس کتاب کو خاص اہمیت حاصل ہے، اور متعدد مقامات پر اس کے 'علیہ الفتویٰ' والے اقوال کو ترجیح دی گئی ہے۔ علاء الدین حصکفی نے بھی 'الدر المختار' میں جگہ جگہ اس سے نقل کیا ہے۔ اس کی قبولیت کا ایک سبب یہ ہے کہ یہ واقعات و نوازل کی اولین جامع کتب میں سے ہے، جس میں نظری مباحث کے ساتھ عملی زندگی کے مسائل کا حل موجود ہے۔ دوسرا سبب مصنف کی فقہی پختگی اور ان کا اہلِ ترجیح میں شمار ہونا ہے؛ فقہی طبقات کی تقسیم میں قاضی خان کو ان فقہا میں رکھا جاتا ہے جن کی ترجیحات کو بعد کے مفتیوں نے اعتماد سے قبول کیا۔ تیسرا سبب اس کی سہل عبارات اور فیصلہ کن اسلوب ہے جس سے عملی مفتی کو فوری رہنمائی ملتی ہے۔ آج بھی برِ صغیر کے دارالافتاؤں میں فتویٰ نویسی کے دوران فتاویٰ قاضی خان بنیادی مراجع میں شامل رہتا ہے، البتہ اہلِ علم یہ تنبیہ بھی کرتے ہیں کہ زمانے و عرف کے بدل جانے سے بعض مسائل کے اطلاق میں موجودہ مفتی کو اصولوں کے اندر رہ کر غور کرنا چاہیے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ فتاویٰ قاضی خان کلاسیکی فقہی ترتیب پر مرتب، ظاہر الروایہ اور متقدمین و معاصرین کے فتاویٰ سے ماخوذ، اور ترجیحی و تطبیقی طرزِ استدلال کی حامل کتاب ہے۔ 'علیہ الفتویٰ' کی تصریحات نے اسے عملی افتا کا کلیدی ماخذ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً آٹھ صدیوں سے یہ کتاب مفتیوں کی میز سے الگ نہیں ہوئی۔ اس کا مطالعہ طالبِ علم کو یہ سکھاتا ہے کہ فتویٰ کیسے جمع، مرتب اور ترجیح کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

سوال نمبر 4: افتا کا تاریخی سفر — انفرادی عمل سے ادارہ جاتی نظام تک

سوال نمبر 4۔ اسلامی تاریخ میں افتا انفرادی علمی عمل سے باقاعدہ ادارہ جاتی نظام تک کن مراحل سے گزرا؟ ہر مرحلے کے اہم ادوار اور نمایاں تبدیلیوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔ (20)

تمہید

افتا کی تاریخ دراصل اسلام کے علمی و تہذیبی ارتقا کی تاریخ ہے۔ نزولِ وحی کے دور میں فتویٰ کا مرجع خود رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی تھی؛ وحی و سنت سے براہِ راست جواب ملتا تھا۔ آپ ﷺ کے بعد یہ فریضہ صحابہ، تابعین اور فقہا نے سنبھالا، پھر جب اسلامی ریاست و سماج وسعت پاتے گئے تو فتویٰ ایک فرد کے ذاتی علمی عمل سے بڑھ کر مکاتبِ فقہ، فتاویٰ کے مجموعوں، سرکاری مفتی کے منصب اور بالآخر دارالافتاء جیسے باقاعدہ اداروں کی شکل اختیار کر گیا۔ اس سوال میں انہی مراحل کا تاریخی تسلسل کے ساتھ جائزہ اور ساتھ تنقیدی تجزیہ پیش کیا جاتا ہے، کیونکہ ادارہ جاتی شکل نے جہاں نظم و یکسانیت عطا کی وہاں کچھ نئے سوالات بھی پیدا کیے۔

پہلا مرحلہ: عہدِ نبوی و صحابہ

عہدِ نبوی میں استفتا کا مرکز مدینہ منورہ تھا؛ لوگ رسول اللہ ﷺ سے مسائل پوچھتے اور جواب پاتے۔ آپ ﷺ نے دور دراز علاقوں میں معلمین و قاضی بھیج کر اس عمل کو وسعت دی۔ آپ ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ کرام نے یہ خدمت انجام دی؛ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطوط کے ذریعے صوبائی حکام کو فقہی رہنمائی بھیجی اور مسائل

میں اہلِ الرائے سے مشاورت کو رواج دیا۔ اس دور کی خصوصیت یہ تھی کہ فتویٰ ذاتی اہلیت و تقویٰ کی بنیاد پر دیا جاتا تھا، کوئی رسمی منصب یا تنخواہ نہیں تھی، اور مفتی صحابہ کی تعداد محدود و معروف تھی۔ حضرت ابو بکر، عمر، عثمان، علی، زید بن ثابت، معاذ بن جبل اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اس دور کے ممتاز مفتیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ دور ادارے سے پہلے کا، مگر اصولوں کی بنیاد رکھنے والا دور تھا۔

دوسرا مرحلہ: تابعین، فقہی مکاتب اور تدوین

تابعین و تبع تابعین کے دور میں اسلامی دنیا پھیل گئی اور ہر بڑے شہر میں علمی حلقے قائم ہوئے۔ مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، شام اور یمن کے فقہا اپنے اپنے ماحول کے مسائل حل کرنے لگے۔ دوسری صدی ہجری میں امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے فقہی مکاتب منظم ہوئے تو فتویٰ فردی اجتہاد کے ساتھ ساتھ ایک خاص منہج و اصول سے وابستہ ہو گیا۔ اسی دور میں اصولِ فقہ کی تدوین (امام شافعی کی ’الرسالہ‘) نے استدلال کو قواعد کا پابند بنایا اور فتاویٰ کی کتب لکھنا شروع ہوئیں۔ اس مرحلے کی نمایاں تبدیلی یہ تھی کہ فتویٰ ’شخص‘ سے بڑھ کر ’منہج‘ کا تابع ہو گیا، جس سے تسلسل اور پیش گوئی (predictability) پیدا ہوئی، لیکن ساتھ ہی مسلکی پابندی اور تقلید کے رجحان کی بنیاد بھی پڑی جس پر آگے چل کر بحثیں ہوتی رہیں۔

تیسرا مرحلہ: سرکاری منصب و اجتماعی افتا

عباسی دور اور اس کے بعد کی سلطنتوں میں ریاست نے علماء و مفتیوں کو سرکاری سرپرستی دینا شروع کی۔ بغداد و دیگر مراکز میں مفتیوں کے حلقے ریاستی نظم کے قریب آئے۔ اس عمل کی مکمل ادارہ جاتی صورت عثمانی دور میں نظر آتی ہے جہاں ’شیخ الاسلام‘ کا منصب قائم ہوا اور اس کے ماتحت ’فتویٰ خانہ‘ میں باقاعدہ دفتری نظام کے ساتھ فتوے لکھے، محفوظ کیے اور جاری کیے جانے لگے۔ صوبائی و ضلعی مفتیوں کی تقرریاں ہوئیں اور فتاویٰ کے معیاری خاکے (فارم) رائج ہوئے۔ اس مرحلے کی مثبت تبدیلی یہ تھی کہ فتویٰ میں یکسانیت، رجسٹریشن اور ذمہ داری کا احساس بڑھا؛ منفی پہلو یہ سامنے آیا کہ ریاستی مفاد کبھی کبھی فتویٰ پر اثر انداز ہو سکتا تھا، جس کی مثالیں مؤرخین تنقیدی طور پر بیان کرتے ہیں کہ حکمران اپنے اقدامات کے لیے فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

چوتھا مرحلہ: جدید دارالافتاء اور اجتماعی اجتہاد

انیسویں و بیسویں صدی میں پرنٹنگ پریس، جدید تعلیمی اداروں اور نو آبادیاتی قانونی تبدیلیوں نے افتا کو نئے مرحلے میں داخل کیا۔ مصر میں دار الافتاء المصریہ (1895ء) جیسے سرکاری ادارے قائم ہوئے، برِ صغیر میں دارالعلوم دیوبند [illegible] ارس نے مستقل دارالافتاء بنا کر اجتماعی فتویٰ نویسی کا نظام رائج کیا، جس میں مفتیان کی ٹیم، اساتذہ کی تصدیق اور رجسٹرڈ ریکارڈ شامل ہوا۔ بیسویں صدی کے آخر میں مجامع فقہیہ اور [illegible] یدیوں نے 'اجتماعی اجتہاد' کا تصور دیا، جہاں پیچیدہ جدید مسائل (بنکاری، طب، ٹیکنالوجی) پر مختلف علوم کے ماہرین مل کر غور کرتے ہیں۔ ڈیجیٹل دور میں آن لائن دارالافتاء، ای میل [illegible] راہیر [illegible] ذریعے فتویٰ لمحوں میں عالمی سطح تک پہنچ رہا ہے۔

تنقیدی جائزہ

اس پورے سفر کا تنقیدی جائزہ لینے سے چند باتیں سامنے آتی ہیں۔ اوّل، ادارہ جاتی شکل نے معیار بندی، ریکارڈ اور ا [illegible] غور جیسی خوبیاں عطا کیں جن کی جدید پیچیدہ مسائل میں شدید ضرورت تھی۔ دوم، تاہم اس کے سائے بھی ہیں: سرکاری وابستگی سے خود مختاری متاثر ہو سکتی ہے، مسلکی ادارے بعض اوقات اختلاف کو شدت دے دیتے ہیں، اور آن لائن افتا میں سائل کی مقامی صورتِ حال و عرف کا لحاظ مشکل ہو جاتا ہے، حالانکہ فقہی اصول یہی ہے کہ فتویٰ زمان و مکان اور احوال کے تغیر سے بدل سکتا ہے۔ سوم، تاریخی تجربہ بتاتا ہے کہ جب بھی افتا کا نظام خالص علمی اہلیت سے ہٹ کر سیاسی یا معاشرتی دباؤ کے تابع ہوا، اس کی ساکھ مجروح ہوئی؛ اور جب علماء نے اصول و آداب کی پابندی کی، اداروں نے امت کی حقیقی رہنمائی کی۔ چہارم، موجودہ دور کا تقاضا یہ ہے کہ ادارہ جاتی افتا میں شفافیت (دلیل کی اشاعت)، ماہرین سے مشاورت اور اجتماعی فیصلے کو فروغ دیا جائے تاکہ فردِ واحد کی خطا کا امکان کم ہو۔

نتیجہ

نتیجتاً افتا کا سفر وحی سے وابستہ براہِ راست رہنمائی سے شروع ہو کر صحابہ و فقہا کے انفرادی علمی عمل، فقہی مکاتب کی منہجی پابندی، عثمانی فتویٰ خانے کی سرکاری تنظیم، اور پھر جدید دارالافتاؤں و فقہی مجامع کی اجتماعی و ڈیجیٹل صورت تک پہنچا ہے۔ ہر مرحلے نے اپنی ضرورت کے مطابق نت نئے انتظامات پیدا کیے۔ تنقیدی سبق یہ ہے کہ شکل چاہے انفرادی ہو یا ادارہ جاتی، فتویٰ کی روح — علم، امانت، آزادیِ رائے اور آداب کی پابندی — کو اصل قرار دیا جائے تو یہ نظام ہر دور میں امت کی رہنمائی کا ذریعہ بنا رہتا ہے۔

سوال نمبر 5: تلفیق اور افتا بہ مذہبِ غیر — معنی، آراء، شرائط اور جدید اطلاقات

سوال نمبر 5۔ تلفیق اور افتا بہ مذہب الغیر سے کیا مراد ہے؟ فقہا کی مختلف آراء، شرائط اور موجودہ دور میں ان کے عملی اطلاقات کا تحقیقی مطالعہ کیجیے۔ (20)

تمہید

فقہی مکاتب کے استحکام کے بعد یہ سوال اہم ہو گیا کہ ایک مسئلے میں مختلف اماموں کے اقوال کو ملا کر عمل کرنا، یا اپنے مسلک کے مفتی کا دوسرے مذہب کے مطابق فتویٰ دینا، کس حد تک درست ہے؟ انہی دو مباحث کو 'تلفیق' اور 'افتا بہ مذہب الغیر' کہا جاتا ہے۔ یہ محض نظری بحث نہیں؛ آج کے دور میں میڈیکل ایمرجنسی، بین الاقوامی سفر و تجارت، اقلیتی مسلمانوں کے مسائل اور جدید مالیاتی معاملات میں یہ مباحث براہِ راست عملی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ جواب تعریفات سے آغاز کر کے فقہا کی مختلف آراء، ان کی شرائط، اور موجودہ دور کے عملی اطلاقات کا تحقیقی جائزہ پیش کرتا ہے۔ آغاز ہی میں یہ وضاحت مناسب ہے کہ یہ بحث تعلیمی و علمی ہے؛ کسی مخصوص شخص یا واقعے پر قطعی شرعی حکم کا اطلاق اہلِ علم مفتیان و شرعی عدالتوں کا کام ہے، طالبِ علم کو اپنی ذاتی صورتِ حال میں مستند دارالافتاء سے رجوع کرنا چاہیے۔

تلفیق کا معنی و حقیقت

تلفیق کا لغوی معنی دو چیزوں کو باہم جوڑنا و ملانا ہے۔ اصطلاحِ فقہ میں تلفیق سے مراد ایک ہی مسئلے یا ایک ہی عمل میں دو یا زائد مجتہدین کے اقوال اس طرح جمع کرنا کہ پیدا ہونے والی مجموعی صورت کسی بھی مجتہد کے نزدیک درست نہ ہو۔ مثال کے طور پر کوئی شخص نماز کے لیے وضو میں ایک مسلک کے اس قول پر عمل کرے جس کی رو سے ایک شرط ختم ہوتی ہے اور دوسرے مسلک کے قول سے دوسری شرط بھی ساقط کر لے، تو ایسا وضو دونوں مسالک میں سے کسی کے نزدیک بھی مکمل نہ رہا۔ یہی ممنوع تلفیق کی کلاسیکی مثال ہے۔ تلفیق سے الگ ایک دوسری صورت ’انتقالِ مذہب‘ یا ’اختیارِ قول‘ ہے، جس میں کسی مسئلے میں مکمل طور پر دوسرے مجتہد کے قول پر اس کی تمام شرائط سمیت عمل کیا جائے؛ فقہا کی اکثریت نے ضرورت و حاجت کے وقت اس کی گنجائش مانی ہے، جبکہ محض خواہشات کی پیروی میں آسان اقوال کی تلاش (تتبع الرخص) کو مذموم قرار دیا ہے۔

افتا بہ مذہب الغیر کا معنی

افتا بہ مذہب الغیر سے مراد یہ ہے کہ مفتی اپنے اختیار کردہ مذہب کے بجائے کسی دوسرے امام یا مذہب کے قول کے مطابق فتویٰ دے، مثلاً حنفی مفتی کسی مسئلے میں مالکی یا شافعی قول پر فتویٰ دے دے۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں: سائل خود دوسرے مسلک کا پیرو ہو اور اپنے مسلک کے مطابق جواب چاہے؛ یا اپنے مسلک کا قول عوام کے لیے شدید تنگی (حرج) کا باعث ہو اور دوسرے مسلک کا معتبر قول موجود ہو؛ یا قانونی و عدالتی سطح پر کسی دوسرے مذہب کے قول کو قانون بنایا گیا ہو۔ عام اصول یہی ہے کہ مفتی اپنے مذہب کے معتمد قول پر فتویٰ دے، مگر مخصوص شرائط کے ساتھ فقہا نے مذہبِ غیر پر افتا کی بھی اجازت دی ہے، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

فقہا کی مختلف آراء

تلفیق کے بارے میں فقہا کی آراء کو تین بڑے رجحانات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ پہلا رجحان مطلق ممانعت کا ہے: متأخرین کی ایک بڑی جماعت، جن کی نمایاں آواز ابن عابدین شامی کی ہے، نے اس تلفیق کو ناجائز کہا جس کی صورت کسی مجتہد کے ہاں درست نہ بنتی ہو، کیونکہ یہ امت کے اجماعی تسلسل سے باہر نئی صورت گھڑنے کے مترادف ہے۔ دوسرا رجحان مشروط جواز کا ہے: کئی معاصر و متقدم فقہا نے کہا کہ اگر تلفیق ایسی صورت پیدا نہ کرے جو سب کے نزدیک باطل ہو، یا حقیقی ضرورت موجود ہو اور قصداً خواہش پرستی نہ

ہو، تو گنجائش نکل سکتی ہے؛ مثال کے طور پر مختلف ابواب یا الگ الگ اعمال میں مختلف اقوال پر عمل کرنا تو اکثر کے نزدیک تلفیق ممنوع سے خارج ہے۔ تیسرا رجحان عوام اور اہلِ علم میں فرق کا ہے: عوام کے لیے اپنے علاقے کے اہلِ علم و مفتیان کی پیروی میں ایک مسلک پر استقامت بہتر قرار دی گئی، جبکہ ضرورت کے موقع پر اہلِ علم کی نگرانی میں دوسرے معتبر قول کی طرف رجوع کی اجازت بھی اسی روایت کا حصہ ہے۔ افتا بہ مذہب الغیر کے بارے میں بھی فقہا کے ہاں اسی نوع کی تفصیل ملتی ہے: اصولاً اپنے مذہب پر افتا، اور ضرورت، حرجِ شدید یا سائل کے اپنے مذہب کی صورت میں دوسرے مذہب پر بھی افتا جائز۔

شرائط

جدول: تلفیق اور مذہبِ غیر پر افتا کی شرائط (خلاصہ)

افتا بہ مذہب الغیر	تلفیق	شرط
دوسرے مذہب کا قول معتبر و مستند ہو	مجموعی صورت کسی معتبر قول میں درست ہو یا حقیقی ضرورت ہو	بنیادی شرط
سائل کی سہولت یا رفعِ حرج مقصود ہو	خواہش پرستی و تتبعِ رخص نہ ہو	نیت
مفتی کو اس مذہب کے اصول و کتب کا واقف ہونا	تمام متعلقہ شرائط و لوازم کا لحاظ	علم
قطعیات و نصوص کے خلاف فتویٰ نہیں	قطعیات و اجماعی مسائل میں گنجائش نہیں	حد

ان شرائط کی تشریح یہ ہے کہ اوّل، مسئلہ ان قطعی امور میں سے نہ ہو جن میں اختلاف ہی نہیں (نماز کی فرضیت جیسی قطعیات)۔ دوم، جس قول کی طرف رجوع کیا جائے وہ معتبر، مستند اور کسی مجتہدِ مطلق یا معروف مکتب سے منسوب ہو، نہ کہ شاذ و بے اصل رائے۔ سوم، نیت درست ہو: مقصد دین آسان بنانا برائے خواہش نہ ہو بلکہ حقیقی

ضرورت، عذر یا حرج دور کرنا ہو۔ چہارم، قول اختیار کرتے وقت اس کی پوری شرائط ولوازم ساتھ لیے جائیں، اپنی سہولت والے حصے چن کر باقی چھوڑ دینا اسی ممنوع تلفیق میں داخل ہے۔ پنجم، یہ عمل علماء کی نگرانی ومشاورت سے ہو، خاص طور پر اجتماعی و قانونی سطح کے فیصلوں میں فقہی مجامع سے رجوع کیا جائے۔

موجودہ دور کے عملی اطلاقات

موجودہ دور میں ان مباحث کے اطلاقات کئی شعبوں میں نظر آتے ہیں۔ مسلم اقلیتی ممالک میں اجتماعی افتا کے ادارے — جیسے یورپی کونسل برائے افتا و تحقیق — نماز کے اوقات، روزے، حلال غذا اور بینک کاری جیسے مسائل میں ضرورت کی بنیاد پر مختلف مکاتب کے اقوال سے استفادہ کرتے ہیں تاکہ اقلیتی مسلمان عسر و حرج سے بچ سکیں۔ اسلامی مالیاتی نظام میں تکافل، صکوک اور جدید بینکاری مصنوعات کی شرعی جانچ کے لیے بین المسالکی شرعی بورڈز قائم ہیں جو مختلف مکاتب کے معتبر اقوال کو باہم ملحوظ رکھتے ہیں۔ بعض مسلم ممالک کے عائلی قوانین میں بھی قانونی اصلاح کے طور پر دوسرے فقہی مکتب کے قول کو قانون کا حصہ بنایا گیا ہے، جسے 'تخیر' و 'تلفیقِ تشریعی' کہا جاتا ہے اور یہ ریاست و مقننہ کی سطح کا عمل ہے، انفرادی خواہش کی نہیں۔ طب و سفر کے بعض مسائل میں بھی جمہور اہلِ علم نے شرائط کے ساتھ سہولت والے معتبر قول کی طرف رجوع کو قبول کیا ہے۔ دوسری طرف اسی رجحان کے غلط استعمال کی صورتیں بھی موجود ہیں: ہر مسئلے میں سب سے آسان قول ڈھونڈنے کو جدید اصطلاح میں مذموم سمجھا جاتا ہے، اور ذمہ دار دارالافتاء اس پر تنبیہ کرتے رہتے ہیں۔

نتیجہ

محاصل یہ کہ تلفیق سے مراد ایک عمل میں اقوال کو اس طرح ملانا ہے کہ نتیجہ کسی مجتہد کے ہاں درست نہ رہے، اور افتا بہ مذہب الغیر سے مراد مفتی کا دوسرے معتبر مذہب کے مطابق فتویٰ دینا ہے۔ فقہا کی غالب رائے یہ ہے کہ اصولی پابندی اپنے مذہب و منہج پر رہنا ہے، تاہم ضرورت، حرج اور عوامی حاجت کے موقع پر سخت شرائط کے ساتھ معتبر اقوال سے استفادے کی گنجائش فقہی روایت میں موجود ہے۔ موجودہ دور میں اقلیتی مسائل، اسلامی مالیات اور قانون سازی میں یہی متوازن منہج رائج ہے۔ طالبِ علم یہ بات بھی یاد رکھے کہ ان مباحث کا علمی مطالعہ الگ ہے اور اپنے ذاتی مسئلے کا قطعی حکم مستند مفتی ہی سے لینا چاہیے۔